اقلیت و اکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی کلچر، اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اسکے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ سر شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اسکے سوا نہیں سوجھتی کہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورت حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اُس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اسکے پاس ہے اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کند ہتھیار اور اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ رہا ہے اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اسکو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جسکا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی پیش نہ آتی۔ اسکے لیے اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے "جماعتوں" کے لیے نہیں۔

جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جان دار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانے کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گذر گیا اور وہ حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپکے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے، دلوں اور دماغوں کو اپیل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اُس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لیکر اگر مسلمان عملی مجاہدہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپکو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ انکو اُس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوت تسخیر چھپی ہوئی ہے۔ انکے دماغوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپکو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالہ کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسر اقتدار ہیں ان میں سے کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز

نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اسکے ارکان بھی ۳۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑیگا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں ۴۰ کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر — قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگی عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پائے، اور اسکو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آئے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لے لیجیے ہر جگہ آپکو یہی نظر آئیگا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے، اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کراتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جنکی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش انکی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں، اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد اور طریق کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوئے ہیں، انہوں نے آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے

تک گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جانفشانی چاہتا ہے، یہ اُس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ انکے ذہن سے اسلام کا صحیح تصور اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیئے گئے ہیں۔ جو اسلام انکے اندر پایا جاتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں یا کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائیگا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ انکے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو امید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام از سر نو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرمانروائی قائم کرنے کے لیے برسرِ کار ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت ان مسلمانوں میں سے اسکو کچھ زیادہ و النفیر نسبتًا زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکینگے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور جنکا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، اُنکو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر لینا چاہیے۔ اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

اول یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیرووں کے اِس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں انکو مجالس قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسند حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے

لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملک خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو ان مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوئے ہیں، اور نہ اسکی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اسکے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لیکر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہیگا بلکہ شائد ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکیگی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدوں اور پیروؤں کی تعداد ملک میں ۶۰ یا ۷۰ فیصدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی جسکے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اسکی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، اور پارٹی کے ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اسکے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو

پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے، اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے۔ مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعت امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمراں بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بہت بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔